# نارسا

''عورت بھی گھاس کی طرح ہوتی ہے۔''
کشور ناہید نے کہیں لکھا تھا۔
''اور گھاس جب سر اٹھانے کے قابل ہوتی ہے تو کاٹ دی جاتی ہے۔''
برسوں پہلے خوش جمال نے پڑھا تھا مگر اسے یقین نہیں آیا تھا۔
''لو بھلا عورت اور گھاس کا کیا مقابلہ۔'' اس نے وہ ہفت روزہ اخبار بی جان کے سامنے پھینکتے ہوئے کہا تھا۔ ''گھاس تو پاؤں تلے روندی جاتی ہے اور بڑے شاہ جی کہتے ہیں کہ ہمارے پیارے نبی ﷺ نے فرمایا تھا...... عورتیں آبگینہ ہوتی ہیں۔''
تب اسے کشور کی بات کتنی غلط لگی تھی۔ لیکن جب اس نے سر اٹھا کر جینے کی کوشش کی تو اسے احساس ہوا تھا کہ کتنے بے شمار ہاتھ ایک ساتھ اسے کاٹنے کے لیے بڑھ آئے تھے اور یہ تو اس کا حوصلہ اور ہمت تھی کہ وہ پھر بھی سر اٹھائے کھڑی تھی اور جینے کی کوشش کر رہی تھی ورنہ یہ سب جو برسوں سے اس کا استحصال کر رہے تھے، اسے مار ڈالتے۔ آج صبح ہی تو بی جان نے اسے بتایا تھا کہ شاہ جی نے اس کے لیے کیا سوچا ہے۔
''وہ کون ہوتے ہیں میرے لیے کچھ سوچنے والے؟''
''وہ تیرے تایا ہیں۔ تیرے قانونی وارث۔'' بی جان نے اسے سمجھانے کی کوشش کی تھی۔ ''تیرے لیے بہتر ہی سوچیں گے۔''
''آج تک انہوں نے ہماری بہتری کے لیے کیا سوچا ہے۔ بی جان۔ جو آج......؟''
''نہیں، آج بھی انہوں نے جو کچھ سوچا ہے، یقیناً اس میں انہوں نے اپنی ہی بہتری سوچی ہوگی۔''



اسے پورا یقین تھا اور اس یقین کو اس وقت اور تقویت ملی جب باؤ جی کی سب سے چھوٹی بیٹی سلمانہ نے اس کے کان میں آکر سرگوشی کی۔
''شاہ جی آپ کی شادی کر رہے ہیں۔''
یہ خبر تو ابھی ابھی بی جان نے اسے سنائی تھی مگر کس کے ساتھ، یہ انہیں بھی علم نہ تھا۔
''آپ میری بھابی بنیں گی، عبدالقدوس بھائی کی دلہن۔''
''میں!'' مارے حیرت کے اس کا منہ کھلا رہ گیا تھا...... ''باؤ جی کا وہ بے ڈول سروالا کم عقل بیٹا۔''
اس نے مدد طلب نظروں سے بی جان کی طرف دیکھا جن کا سر جھک گیا تھا۔ اور آنکھیں بے اختیار آنسو بہانے لگی تھیں۔ اور بی جان تو ہمیشہ کی بزدل تھیں، وہ بھلا کیا کر سکتی تھیں۔
تب وہ بی جان کو روتا چھوڑ کر یونہی تنتناتی ہوئی شاہ جی کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔
''شاہ جی! میں کل صبح لاہور جا رہی ہوں یونیورسٹی میں ایڈمیشن لینے کے لیے۔''
''یہ خودسری ہے شاہ جی۔'' پاس بیٹھی بی بی جی نے کہا۔ ''ہمارے خاندان کی لڑکیوں نے پہلے کہاں اتنا پڑھا ہے۔ اس نے ضد کی چودہ جماعتیں پڑھ لیں۔ بس بہت ہے۔ اب ہاتھ پیلے کریں۔''
''ہاں یہی سوچا ہے۔'' شاہ جی نے اس کی طرف دیکھے بغیر کہا۔ ''خوش جمال ہم نے تمہاری شادی عبدالقدوس کے ساتھ طے کر دی ہے۔ اگلے جمعے کو نکاح......''
''مجھے یہ شادی نہیں کرنی۔'' اس نے اپنے غصے کو دباتے ہوئے کہا۔
''اے ہے خوش جمال، پڑھ لکھ کر تو تیری مت ماری گئی ہے۔ کیسے پڑ پڑ بول رہی ہے تو۔ کیا خرابی ہے عبدالقدوس میں؟ سیدھا سادہ معصوم تیرے چاچا کا بیٹا ہے۔ گھر والے ہی اسے ٹھکرا دیں گے تو باہر سے کون رشتہ دے گا۔''
''وہ اتنا ہی اچھا اور سیدھا سادا ہے تو آپ کیوں نہیں بنت سلمیٰ کا رشتہ اس سے طے کر دیتیں، آخر کو وہ سلمیٰ آپا کے چاچا کا بھی بیٹا ہے۔''
اس کی کنپٹیاں سلگ رہی تھیں اور اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ اس نے سر اٹھا کر شاہ جی کی طرف دیکھا جو سر جھکا کر تسبیح کے دانے گرا رہے تھے۔
''شاہ جی!'' اس نے مدد طلب نگاہوں سے انہیں دیکھتے ہوئے پکارا۔
مگر شاہ جی نے سر اٹھا کر اسے نہیں دیکھا کیونکہ وہ اس سے نظر ملا کر بات نہیں کرتے تھے جیسے ان کے دل میں چور ہو۔

اس کی جائیداد ہڑپ کرنے کا چور۔
اس کا حق غصب کرنے کا چور
اور اس کے ساتھ زیادتی کرنے کا چور

تب ایک لمحہ انہیں دیکھنے کے بعد وہ واپس پلٹ آئی بی جان اسی طرح بیٹھی آنسو بہا رہی تھیں۔ اس نے آتے ہی سب کچھ ان کے گوش گزار کر دیا۔ تو ان کے آنسو اور بھی تیزی سے بہنے لگے اور رنگ زرد پڑ گیا۔

''شاہ جی تو ناراض ہو گئے ہوں گے؟'' انہوں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا تو وہ جھنجلا گئی۔

''تو آپ ساری زندگی ان کی ناراضی سے ڈرتی رہیں، چاہے وہ ہمیں ٹکڑے ٹکڑے کر کے ہمارا گوشت کووں کے آگے ڈال دیں۔ کیا دیا ہے آج تک انہوں نے ہمیں؟''

''تو تو ناشکری ہے خوش جمال۔'' انہوں نے اپنے آنسو پونچھے۔ ''شاہ جی نے پناہ دے رکھی ہے ہمیں۔ یہ گھر اور اپنا تحفظ دیا ہے۔ نکال دیتے تو کیا کر لیتی میں۔''

''اس گھر پر ہمارا حق نہیں تھا کیا۔ کیا میرا باپ بڑے شاہ جی کی اولاد نہیں تھا؟''

''تیرے ساتھ بحث کون کرے خوش جمال! حق والا ہی نہ رہا تو حق کیسا۔''

''تو پھر'' آنسو اس کی بھی پلکوں کا بند توڑ کر باہر نکل آئے۔ شکر گزاری کے طور پر کر دیجئے اپنی بیٹی کو قربان۔ اس عبدالقدوس کی دلہن بنانے سے تو بہتر ہے کہ آپ خود ہی مجھے زہر دے دیجئے۔

اور بی جان نے لپک کر اسے گلے لگا لیا۔

''میں کیا کروں میری جان مجھے بتا؟''

''آپ کچھ بھی نہ کریں بی جان، میں خود سب کچھ کر لوں گی۔ بس آپ اتنی بزدل نہ بنیں۔ بس تھوڑی سی اور تکلیف ہے۔ میں نوکری کر لوں گی اور آپ کو یہاں سے لے جاؤں گی۔ میں آپ کے دل میں چھپے دکھوں کے ایک ایک کانٹے کو چن لوں گی، بس آپ مجھے بے حوصلہ نہ کیا کریں۔''

''اور وہ تیرے شاہ جی اور باؤ جی......''

''میں ان سب سے خود نبٹ لوں گی۔''

''وہ تیرے چاچا اور تایا ہیں۔''

''جانتی ہوں۔''

اور اس نے اپنے ہاتھوں سے ان کے آنسو پونچھے اور فوراً چائے کی پیالی بنا لائی۔



''بی جان آپ کچھ نہ سوچیں۔'' اس نے التجا کی۔

لیکن پھر بھی ان کی پیشانی پر تردد تھا اور وہ گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ بچپن سے ہی جب سے اس نے ہوش سنبھالا تھا، اس نے بی جان کو یونہی گہری گہری سوچوں میں ڈوبے ہوئے دیکھا تھا۔ وہ صبح سے شام تک کام میں لگی رہتی تھیں۔ اتنا بڑا خاندان تھا اور اتنے بڑے خاندان کا ناشتا کھانا سب وہ خود تیار کرتی تھیں۔ صبح سویرے جب وہ ابھی سو رہی ہوتی تھی تو بی جان اٹھ کر اندر حویلی میں آ جاتی تھیں۔ وہ خود ہی اٹھ کر منہ ہاتھ دھوتی تھی اور پھر چپلیں گھسیٹتی ہوئی حویلی کے باورچی خانے میں پہنچ جاتی تھی جہاں بی جان پراٹھے پکاتے پکاتے ایک نظر اسے دیکھتی تھیں۔

''تو اٹھ گئی؟''

وہ سر ہلا کر وہیں دہلیز پر بیٹھ جاتی تھی۔ اور بی جان پھر اس کی طرف سے منہ موڑ کر ناشتا بنانے لگتی تھیں۔ اور پھر سب کو ناشتا دے کر آخر میں وہ دونوں ماں بیٹی وہیں باورچی خانے میں بیٹھ کر ناشتا کر لیتیں۔ اسی طرح دوپہر اور رات کا کھانا بھی وہ الگ اپنے کمرے میں بیٹھ کر کھاتی تھیں، جب کہ باقی سب لوگ بڑے کمرے میں اکٹھے کھانا کھاتے تھے۔ دری پر دسترخوان بچھا دیا جاتا تھا اور پھر بی جان کھانا لگا کر گرم گرم پھلکے بنائے جاتی تھیں اور سب سے آخر میں ایک پلیٹ میں سالن ڈال کر اور دو پھلکے دسترخوان میں لپیٹ کر وہ اپنے کمرے میں آ جاتیں۔

''ہم ادھر کھانا کیوں نہیں کھاتے سب کے ساتھ بڑے کمرے میں بیٹھ کر؟'' باشعور ہوتے ہی اس نے بی جان سے پوچھا تھا۔ ''کیا ہم ان کے نوکر ہیں؟''

''نہیں۔ نوکر ایسے ہوتے ہیں۔ شاہ جی تیرے سگے تایا ہیں اور باؤ جی چچا ہیں تیرے۔''

''پھر ہم......ہم کیا ہیں، بتائیے بی جان۔ ہم کیا ہیں؟'' وہ بدستور الجھن کا شکار تھی۔

''چپ کر خوش جمال۔ زیادہ سوال نہ کیا کر۔'' بی جان اس کے سوالوں سے اور اس کی ذہانت سے ڈرتی تھیں۔ ''لڑکیوں کو زیادہ ذہین نہیں ہونا چاہیے۔''

''کیوں؟'' وہ اپنی بڑی بڑی آنکھیں پھیلا کر پوچھتی۔

''بس کہا نا ذہین لڑکیاں زیادہ دکھ اٹھاتی ہیں۔''

''یہ کوئی کلیہ نہیں ہے اور میں تو اپنے بابا کی طرح ذہین ہوں اور اپنے بابا کی طرح بہت سارا پڑھوں گی اور پھر ہم یہاں نہیں رہیں گے۔ اپنا گھر الگ بنائیں گے اچھا سا۔ اور وہاں آپ کو دو درجن لوگوں کے لیے روٹیاں نہیں پکانا پڑیں گی، ہم ایک نوکر رکھ لیں گے۔''

بہت چھوٹی عمر میں ہی اس نے خواب دیکھنا شروع کر دیے تھے اور بہت سی باتوں کی

آ گہی اسے ہوگئی تھی۔

اس اتنی بڑی حویلی کے ایک کونے میں بنا ایک کمرے والا یہ کوارٹر جو شاید کسی زمانے میں نوکروں کے لیے بنایا گیا ہوگا، اب ان کی رہائش گاہ تھا اور اسے وہ انیکسی کا نام دیتی تھی۔ ایک کمرہ چھوٹا سا برآمدہ اور صحن، ایک غسل خانہ اور باورچی خانہ۔

''کیا بابا کے حصے میں اتنی ہی جگہ تھی؟'' کئی بار اس نے بی جان سے پوچھا تھا، اور بی جان نے اسے ڈانٹ دیا تھا۔

''چپ کر، یہ بھی شاہ جی کی مہربانی ہے۔''

اور اسے سمجھ نہیں آتا تھا کہ بی جان اتنی بزدل کیوں ہیں اور وہ سر اٹھا کر اپنا حق کیوں نہیں مانگتیں۔ اور جب وہ کوئی ایسی بات کرتی تھی تو بی جان رونے لگتیں اور وہ ان کی خاطر چپ کر جاتی تھی ورنہ اس کا دل چاہتا تھا کہ کسی دن شاہ جی کا گریبان پکڑ لے اور پوچھے کہ کیا اس کے بابا کا کوئی حق نہ تھا۔ اس نے شاہ جی سے تو کچھ نہ پوچھا تھا لیکن بی بی جی اور چاچی اور گھر کے دوسرے افراد خود ہی اسے احساس دلاتے رہتے تھے کہ اس کا کوئی حق نہیں ہے۔ کبھی وہ جو بی جان کی مدد کے لیے اندر حویلی میں چلی جاتی تو بڑے سرخ پایوں والے پلنگ پر بیٹھے بیٹھے چھالیا کترتے ہوئے بی بی جی چاچی سے کہتیں۔

''صمد کو تو ہمیشہ سے شوق تھا پڑھنے کا، اپنی ساری جائیداد فروخت کر کے تعلیم پر خرچ کر دی اور شاہ جی نے کتنا سمجھایا تھا کہ پڑھ لکھ کر وقت ضائع مت کرو۔ پر صمد تو ہمیشہ کا ضدی تھا۔ آج جائیداد ہوتی تو بیوی بیٹی کے کام آتی۔''

''ہاں۔'' چاچی ہاں میں ہاں ملاتیں۔ ''یہ تو شاہ جی کی مہربانی کہ انہوں نے سر چھپانے کو ٹھکانا دے دیا۔''

''یوں نہ دیتے بھئی۔'' بی بی جی کن انکھیوں سے اسے دیکھتیں۔ ''آخر بھائی کی اولاد کو دھکے کھاتے بھی تو نہیں دیکھ سکتے تھے نا۔''

اور وہ چڑ کر سوچتی کہ لاکھوں کروڑوں کی جائیداد کیا بابا کی تعلیم پر خرچ ہوگئی تھی۔ اور بابا نے کون سے غیر ممالک سے تعلیم حاصل کی تھی۔ پنجاب یونیورسٹی سے انگلش لٹریچر میں ایم اے ہی تو کیا تھا اور پھر وہاں ہی کسی کالج میں لیکچرر شپ اختیار کر لی تھی۔ وہ تو لٹریری آدمی تھے۔ انہیں زمینوں جائیدادوں سے کوئی دلچسپی ہی نہ تھی۔ اور شاہ جی اور باؤ جی نے مل کر یہ جائیداد ہتھیا لی تھی۔ مگر وہ یہ بات شاہ جی سے کہہ نہیں سکتی تھی کیونکہ بی جان کو یہ پسند نہ تھا۔ سو وہ چپ چاپ بی جان کا ہاتھ بٹائے جاتی تھی۔ کیونکہ جانتی تھی کہ اتنے بڑے کنبے کا کھانا پکانا اب بی جان کے بس میں نہیں



رہا تھا، وہ تھک جاتی تھیں۔ اگرچہ ظاہر نہیں کرتی تھیں۔

اس حویلی میں شاہ جی تھے، اس کے بڑے تایا۔ بی بی جی تھیں، شاہ جی کی بیوی اور پھر ان کی چھ اولادیں، چار بیٹے دو بیٹیاں اور باؤ جی تھے۔

اس کے چچا اور چاچی تھیں اور ان کے سات بچے تھے۔ سب سے بڑا عبدالقدوس جو ابنارمل تھا اور پھر بے جی تھیں۔ اس کی پھوپھی جو جوانی ہی میں بیوہ ہوگئی تھیں اگرچہ ان کی ذاتی جائیداد تھی اور بے شمار زمینیں تھیں مگر اپنے تینوں بچوں کے ساتھ وہ ادھر ہی رہتی تھیں اور ان کی زمینوں اور جائیداد کی دیکھ بھال شاہ جی اور باؤ جی ہی کرتے تھے۔ اور پھر اوپر کا اور باہر کا کام کرنے والے دو چار نوکر تھے۔

اسے یہ گھر اور اس کا ماحول پسند نہ تھا۔

اس گھر کے سارے لڑکے نکمے اور بے کار تھے۔

کچھ پڑھ رہے تھے، کچھ نے پڑھائی چھوڑ رکھی تھی۔ اور جو پڑھ رہے تھے ان کے مشاغل بھی وہی تھے۔ پتنگ بازی اور کبوتر بازی۔ شاہ جی اور باؤ جی نے انہیں کبھی منع نہیں کیا تھا۔ اس گھر کے لڑکوں کو کام کرنے کی ضرورت بھی کیا تھی۔ زمینوں سے اتنا کچھ آ جاتا تھا کہ سب عیش کرتے تھے۔ گھر میں دو دو گاڑیاں تھیں، لڑکوں کے پاس اسکوٹر تھے۔

لڑکیاں بھی ان پڑھ اور جاہل تھیں۔ سلمیٰ آپا نے پانچ جماعتیں پڑھی تھیں، جبکہ ہاجرہ نے چھٹی میں اسکول چھوڑ دیا تھا اور صالحہ نے بڑی مشکل سے آٹھویں تک اپنی گاڑی کھینچی تھی۔ اور پھر امتحان سے چند دن پہلے بیمار پڑ کر جان چھڑا بیٹھی تھیں۔ چھوٹی لڑکیاں ابھی دوسری تیسری میں پڑھ رہی تھیں۔ سلمیٰ آپا، ہاجرہ، صالحہ دن میں چار سوتی اور دوسوتی کی چادروں پر کڑھائی کرتیں اور دنیا جہان کے فضول قصے سناتی رہتیں۔ خوش جمال کا دل ان کی محفل میں نہیں لگتا تھا۔

بی بی جی اور چاچی جی کے پاس وقت بے وقت محلے کی عورتوں کا جمگھٹا رہتا۔ کسی کو اپنی ساس کا وجود کھٹکتا تھا اور کسی کو نندیں زہر لگتی تھیں۔ اور کوئی دیور سے شاکی تھی۔ تو کسی کو شوہر پر قابو پانے کے لیے تعویذ چاہیے ہوتا تھا۔

اور بی بی جی لکڑی کی صندوقچی سے تعویذ نکال نکال انہیں دیتی رہتی تھیں۔

اور وہ حیرت سے بی جان سے پوچھتی۔

''یہ ساری عورتوں کو اپنی ساس اور نندوں سے اتنی شکایتیں کیوں ہوتی ہیں؟'' اس ایک شخص کے طفیل، اس ایک شخص کے صدقے میں کیا وہ اس سے منسلک اس کی ماں اور بہنوں کو قبول نہیں کر سکتیں؟''

"خوش جمال! خوش جمال مت سوچا کر زیادہ۔" بی جان اس کے سوالوں سے جھنجلا جاتیں اور وہ بی جان کو "سگ لیلیٰ" کا فلسفہ نہ سمجھا پاتی۔

"خوش جمال تو بھی کچھ کڑھائی سلائی سیکھ لے۔" بی جان نے کئی بار میز پوش اور سوئی دھاگا دے کر سلمٰی کے پاس بٹھانے کی کوشش کی لیکن وہ وہاں سے اٹھ آتی تھی۔ اسے سلائی کڑھائی سیکھنے سے نفرت نہ تھی، بس اسے تو سلمٰی، ہاجرہ اور ان کی سہیلیوں کی باتیں اچھی نہیں لگتی تھیں۔ پتا نہیں کیسی باتیں کرتی تھیں وہ عجیب عجیب۔ اور وہ میز پوش اور سوئی دھاگا پھینک کر کتابیں کھول کر بیٹھ جاتی۔ اسے پڑھنا تھا بہت اور ماں کو اس عذاب سے نکالنا تھا۔ ان کے جھکے ہوئے سر کو وہ اٹھا ہوا دیکھنے کی متمنی تھی۔ اتنی بڑی حویلی نہ سہی ایک چھوٹا سا خوبصورت گھر بنانے کی خواہش اس کے دل میں ہمہ وقت ہلکورے لیتی رہتی تھی۔ اور اسی خواہش نے تو اسے منہ زور بنا دیا تھا۔ جب بی جان نے آٹھویں کے بعد اسے شاہ جی کا حکم سنایا کہ بس اب وہ گھر بیٹھے تو وہ بپھر گئی۔

"مجھے پڑھنا ہے۔"

"کیا کرے گی پڑھ کر تو.....؟" بی جان بے بس ہو کر کہتیں۔

وہ ابھی صرف چودہ برس کی تھی لیکن اس کے اندر اعتماد تھا اور بی جان جانتی تھیں کہ وہ شاہ جی سے ذرا بھی خوفزدہ نہیں ہوتی اور وہ وہی کرے گی جو کہہ رہی ہے۔

"دیکھ، تیرے شاہ جی کے پہلے ہی ہم پر بہت احسان ہیں۔ وہ کب تک تیری تعلیم کا خرچ برداشت کریں گے۔ میں ان پر اتنا بوجھ ڈالنا نہیں چاہتی۔"

"تو مت ڈالیں بوجھ، میں کب کہہ رہی ہوں کہ میری تعلیم کا خرچ وہ برداشت کریں۔ اسکول میں یتیم بچیوں کے لیے خصوصی فنڈ موجود ہے، میں وہاں درخواست دے دوں گی۔"

"تو تو وہاں سے پیسہ لے گی، لوگ کیا کہیں گے، شاہ جی کی بھتیجی اور" بی جان کی آنکھیں پھٹ گئیں۔

"کہتے رہیں مگر بی جان، میں نے پڑھنا ہے۔ اگر آپ کو یہ منظور نہیں تو شام کو میں ایک دو گھروں کے برتن دھولوں گی۔ لیکن میں پڑھوں گی ضرور۔"

اور یہ دونوں باتیں ہی قابل قبول نہ تھیں۔

"بچی ہے شاہ جی۔" بی جان نے روتے روتے کہا۔ "ضد پر اڑ گئی ہے۔ باپ کی طرح اسے بھی علم حاصل کرنے کا بہت شوق ہے۔"

اور شاہ جی کو اس کے شوق سے زیادہ اپنی عزت کا خیال تھا۔ اور اس سے تو کچھ بعید نہ تھا کہ وہ چار گھروں کے برتن ہی دھونے لگتی۔ سو انہوں نے اجازت دے دی اور یوں اس نے میٹرک



کرلیا۔ اور اس گھر میں یہ اعزاز صرف عبدالعلی کو حاصل تھا کہ اس نے پچھلے برس تین سال مسلسل فیل ہونے پر تھرڈ ڈویژن میں میٹرک پاس کیا تھا۔ اور اس نے ضلع بھر میں اول پوزیشن حاصل کی تھی۔ اسکول کی طرف سے اسے گولڈ میڈل دیا گیا تھا۔

اور ایک بار پھر اس کی پڑھائی کا مسئلہ گھر میں عراق ایران جنگ کی طرح طول پکڑ گیا تھا۔

"کیا کرے گی اتنا پڑھ لکھ کر؟" بی جان اسے سمجھاتیں...... "لڑکیوں کے لیے دس جماعتیں بہت ہیں۔ پڑھی لکھی لڑکیوں کی زندگی کامیاب نہیں ہوتی۔ جاہل لڑکیاں زیادہ کامیاب زندگی گزارتی ہیں۔ انہیں کم دکھ ملتے ہیں۔"

شاید بی جان سچ کہتی ہوں، ان کے سامنے ان کی اپنی زندگی کے تجربے تھے لیکن وہ ان کا فلسفہ ماننے کو تیار نہ تھی۔ یہ صحیح کہ جاہل لڑکیاں گھریلو سیاست کے جو داؤ پیچ جانتی ہیں، پڑھی لکھی لڑکیاں تو ان کا عشر عشیر بھی نہیں جانتیں۔ اس نے خود دیکھا تھا بی جی کے پاس جو عورتیں آتی تھیں وہ ان پڑھ ہوتی تھیں۔

لیکن ان کی باتیں...... توبہ شوہر کو قابو میں کرنے کے گر بیٹے کو ماں سے اور بھائی کو بہنوں سے بدظن کرنے کے طریقے انہیں ازبر ہوتے تھے۔

وہ گھریلو سیاست کی ماہر سیاست داں ہوتی ہیں۔

مگر اس کے باوجود وہ پڑھنا چاہتی تھی کیونکہ اسے کچھ بننا تھا لہٰذا اسے بہت جنگ کرنا پڑی۔

بی بی جی اور چاچی کے طنز۔
سلمٰی اور ہاجرہ آپا کے وار۔
عبدالعلی اور عبدالشکور کی تمسخر اڑاتی نظریں۔
شاہ جی اور باؤ جی کا غصہ۔
اور سب سے بڑھ کر بی جان کے آنسو۔
مگر اس نے ان سب کو شکست دی تھی۔

اور اب جب وہ بی اے کر چکی تھی تو جانے شاہ جی کے دل میں کیا خوف آ سمایا تھا کہ وہ اس کے پر کاٹنا چاہتے تھے اور آج ہی کشور ناہید کی اس بات کا مطلب جو اس نے برسوں پہلے پڑھی تھی، اس پر واضح ہوا تھا۔ وہ سر اٹھانے کے قابل ہوگئی تھی۔ اس لیے اسے کاٹنے کی تدابیر کی جا رہی تھیں لیکن وہ کسی کو اس کی اجازت نہیں دے سکتی تھی۔

"بی جان۔" اس نے گہری سوچوں میں ڈوبی بی جان کی طرف دیکھا۔ "آپ فکر کیوں کرتی ہیں؟"

"ارے کیسے فکر نہ کروں، طوفان آجائے گا۔"

"آنے دو بی جان۔" اس نے بے پروائی سے کہا۔

اسے آنے والے طوفان کی پروا نہیں تھی کیونکہ اسے اپنے حوصلوں پر فخر تھا لیکن جب طوفان آیا تو اس کے قدم بھی ذرا کی ذرا ڈگمگا گئے مگر پھر اس نے اپنے پاؤں زمین پر مضبوطی سے جماتے ہوئے سلمٰی سے کہا۔

"سلمٰی آپا، شاہ جی سے کہہ دیجیے کہ اگر وہ زمین کے لیے یہ سب کچھ کر رہے ہیں تو مجھے کسی چیز کی چاہ نہیں۔ میں اپنے ہر حق سے دستبردار ہوتی ہوں اور انہیں تحریر دے دیتی ہوں کہ میرا کوئی حق نہیں ہے ان پر یا کسی بھی چیز پر لیکن مجھے عبدالقدوس سے شادی نہیں کرنا ہے اور اگر میرے ساتھ زبردستی کی گئی تو میں عین نکاح کے وقت انکار کر دوں گی یا پھر زہر کھا لوں گی اور لکھ جاؤں گی کہ مجھے شاہ جی نے زہر کھانے کے لیے مجبور کیا ہے۔"

"عبدالقدوس نہ سہی تو عبدالعلی۔" شاہ جی نے اس مسئلے کا حل یوں نکالا۔ وہ ہر صورت میں اس کی پرواز ختم کرنا چاہتے تھے۔

"نہیں، اس گھر کے کسی لڑکے سے بھی مجھے شادی منظور نہیں۔" اس نے گویا فیصلہ سنا دیا۔ "مجھے یونیورسٹی میں داخلہ لینا ہے، میں اپنے بابا کی طرح انگلش میں ایم اے کروں گی اور پھر کالج میں پڑھاؤں گی۔"

"کیا کچھ نہ ہوا، کیسے کیسے اسے روکنے کی کوشش نہ کی گئی۔ اور کتنا دباؤ اس پر ڈالا گیا۔

مگر آخر میں جیت اسی کی ہوئی۔

شاہ جی نے اس پر لعنت بھیج دی۔

بی بی جی نے اسے آوارہ، مرتد اور نہ جانے کیا کیا خطاب دے ڈالے۔

"وہ تو عبدالقدوس اور عبدالعلی کے قابل ہی نہ تھی۔"

چاچی جی نے کہا۔

"وہ تو شاہ جی، عبدالصمد کی بیٹی سمجھ کر اس پر ترس کھا رہے تھے۔" بے جی کہاں چپ رہنے والی تھیں۔

"توبہ، سید گھرانے کی لڑکی اور لڑکوں کے ساتھ یونیورسٹی میں پڑھے گی۔" بی بی ہر آئے گئے کے سامنے دکھڑا روتیں۔



شاہ جی نے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ وہ اس کی مزید تعلیم کے لیے ایک پیسہ بھی خرچ نہیں کر سکتے اس طرح شاہ جی نے اپنا تحفظ کا ہاتھ اس کے سر سے اٹھا لیا تھا۔

بی جان کانپ کانپ کر روتیں اور اس کے آگے ہاتھ جوڑتیں۔

"سوچ لے خوش جمال، اب بھی سوچ لے۔ عبدالعلی میں کیا برائی ہے۔ عبدالقدوس تو دیوانہ تھا کم عقل تھا، پر عبدالعلی تو دس جماعت پاس ہے۔"

"بس بی جان، آپ کچھ نہ کہیں۔" وہ ان کے جڑے ہاتھوں کو آنکھوں سے لگاتی، ہونٹوں سے چھوتی۔

اور پھر بی جان نے اس کے پختہ ارادوں کے آگے ہار مان لی۔

اور اس کی شادی کے لیے سنبھال کر رکھا ہوا اپنا زیور فروخت کر کے پیسہ پیسہ اس کے نام بینک میں جمع کرا دیا اور وہ یونیورسٹی میں پڑھنے کے لیے لاہور چلی آئی۔

"میں نے کہیں پڑھا تھا کہ عورت گھاس کی طرح ہوتی ہے اور گھاس جب سر اٹھانے کے قابل ہوتی ہے تو کاٹ دی جاتی ہے۔ اور میں نے اس بات کو غلط ثابت کرنے کی سر توڑ کوشش کی ہے حالانکہ میرے راستوں کو کانٹوں اور پتھروں سے پاٹ دیا گیا تھا لیکن میں نے خود کو کٹنے نہیں دیا۔"

"اور میں نے بھی۔" سومیہ حیات نے پیکنگ کرتے ہوئے کہا۔ "میرے لوگوں نے بھی مجھ پر زندگی کے دروازے بند کرنے کی پوری کوشش کی۔ تمہیں پتا تو ہے سب۔"

"ہاں۔" خوش جمال نے ہاتھوں کی کٹوریوں میں ٹھوڑی ٹکتے ہوئے سومیہ کو دیکھا۔

"میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ آخر لوگ، ہمارے رشتے دار اور عزیز یہ کیوں چاہتے تھے کہ ہم چاروں بہنیں ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھی رہیں اور ہم لوگ بھوکے مریں۔"

"ہاں، پتا نہیں، لوگوں کو اور خاص طور پر عزیزوں اور رشتے داروں کو سمجھنا بہت مشکل ہوتا ہے، یہ کسی حال میں بھی خوش نہیں رہتے۔ تم لوگ کچھ بھی نہ کرتے تب بھی یہ لوگ باتیں کرتے کہ چار جوان بیٹیاں ہیں، محنت کیوں نہیں کرتیں اور اب تم لوگ جدوجہد کر رہی ہو تو بھی۔"

"اور میں نے تو سوچ رکھا تھا کہ میں کبھی ہمت نہیں ہاروں گی۔ مجھے اپنے ابا کا سہارا بننا ہے، ان کا بیٹا بن کے دکھانا ہے۔" سومیہ نے بیگ کی زپ بند کرتے ہوئے اس کی طرف دیکھا "اور اب مشکل وقت گزر گیا ہے۔ بالآخر یہ دو سال خوش جمال میں بتا نہیں سکتی تمہیں؛ میں نے کتنی اذیت اٹھائی ہے اور کیسی کیسی باتیں برداشت کی ہیں۔ جب بھی چھٹیوں میں گھر جاتی تھی تو میری پھوپھیاں اور میرے چچا، میری خالائیں اور میری ممانیاں ایسی ایسی باتیں کرتی تھیں کہ کبھی تو

میں ہمت ہارنے لگتی تھی۔"

اور وہ خود...... اس نے کچھ کم اذیت اٹھائی تھی۔ شاہ جی اور باؤ جی تو اس سے کلام ہی نہیں کرتے تھے۔ بے جی، چچی جی اور بی بی جی کی باتیں اس کا جی جلاتی تھیں۔ اور عبدالعلی کی طنزیہ نظریں اور تمسخر اڑاتی باتیں اور پھر صالحہ اور سلمٰی آپا کی کھوج لگاتی نظریں اور ان کے فضول سوال۔

"کس کس لڑکے سے دوستی ہوئی؟" سلمٰی آپ اوپر سے نیچے تک اسے کھوجتی نظروں سے دیکھتی تھیں۔

"کسی سے نہیں۔" وہ تحمل کا مظاہر کرتی۔

"جھوٹ نہیں بولو" صالحہ اس کے قریب کھسک آتی۔ "سچی بتاؤ نا۔ میں کسی سے نہیں کہوں گی۔"

"میں وہاں لڑکوں سے دوستیاں کرنے نہیں گئی، پڑھنے گئی ہوں۔"

"سب پڑھنے ہی تو جاتے ہیں مگر دوستی تو ہو جاتی ہے۔" صالحہ وی سی آر پر دیکھی جانے والی فلمی معلومات کا رعب جھاڑتی۔

"ایسے ہی تو ہوتا ہے۔ کتنا مزہ آتا ہوگا تمہیں اپنے کسی کلاس فیلو کے ساتھ اسکوٹر پر بیٹھ کر سیر کو جانے میں۔" سلمٰی آپا چٹخارا لیتیں تو وہ جھنجلا کر ان کے پاس سے اٹھ آتی تھی۔

اور پھر سب سے بڑھ کر بی جان کے آنسو تھے جو اس کے قدموں کی زنجیر بن جاتے تھے لیکن وہ ہمت کر کے ہر بار آنسوؤں کی یہ زنجیر توڑ کر واپس آ جاتی تھی۔

"لیجیے جناب، ہماری تیاری تو ہوگئی۔" سومیہ اٹھ کر اس کے پاس آ بیٹھی۔ "خوش جمال، بہت یاد آؤ گی۔ یہ دو سال جو تمہارے ساتھ گزارے ہیں، بہت اچھے گزارے۔" سومیہ نے اداسی سے کہا۔ تو وہ بھی اداس ہوگئی۔

"ہاں، تم بھی مجھے بہت یاد آؤ گی۔"

ان دو سالوں میں سوائے سومیہ کے اس کی کسی سے دوستی نہیں ہوئی تھی۔ سومیہ اس کی روم میٹ بھی تھی۔ تاہم شروع میں تو بہت دن تک علیک سلیک سے آگے بات نہیں بڑھی تھی مگر پھر جلد ہی خوش جمال کو احساس ہوگیا تھا کہ وہ اور سومیہ ایک جیسی ہیں۔ دونوں کا مقصد ایک ہے۔ دونوں ایک ہی مشکل راستے پر چل کر یہاں تک پہنچی ہیں۔

سومیہ کا باپ سینئر کلرک تھا۔ اس کی چار بہنیں تھیں اور ایک بھائی جو ابھی صرف سات سال کا تھا اور بہت مشکل سے گزر بسر ہوتی تھی۔ اس کی بڑی بہن نے میٹرک کے بعد پی۔ ٹی سی



کر کے ایک سکول میں نوکری کر لی تھی کیونکہ کمانے والا ایک ہی تھا اور کھانے والے آٹھ۔ رشتے داروں نے بہت باتیں کیں۔ بیٹی کی کمائی کھانے کے طعنے دیے اور اب سومیہ تھی جو تعلیمی منازل طے کرتی ہوئی یہاں تک آ پہنچی تھی۔ رشتے داروں نے اس کے راستے میں رکاوٹوں کی دیواریں نہیں، پہاڑ کھڑے کیے لیکن اس کی آنکھوں میں ایک روشن مستقبل تھا۔ وہ اپنے گھر کو خوش حال دیکھنا چاہتی تھی اور اپنے بھائی کو اعلیٰ تعلیم دلانا چاہتی تھی۔ اس لیے وہ ان ساری رکاوٹوں کو پھلانگ کر یہاں تک آ پہنچی تھی۔ سو دونوں میں بہت گہری دوستی ہوگئی تھی۔

وہ سومیہ کے علاوہ کسی سے دوستی نہ کر سکی تھی۔ حالانکہ ہر طرح کی لڑکیاں تھیں۔ پڑھاکو لڑکیاں بھی اور وہ بھی جو صرف انجوائے کرنے آتی تھیں۔ ایک دو پیریڈ اٹینڈ کیے، کوک یا چائے پی اور ہنس کھیل کر چلی گئیں۔ ہر طرح کے طالب علم تھے۔ خود اس کے اپنے ڈیپارٹمنٹ میں بہت اچھے لڑکے اور لڑکیاں تھیں لیکن وہ اپنے آپ میں مگن رہتی تھی۔ البتہ یہاں آ کر اس کے تجربات اور علم میں بہت اضافہ ہوا تھا اور اس نے بی جان کو لکھا تھا۔

"بی جان۔ دنیا بہت وسیع ہے اور اس وسیع دنیا میں بھانت بھانت کے لوگ بستے ہیں۔"

اور انہی بھانت بھانت کے لوگوں میں راغب ارمان بھی تھا۔ یونیورسٹی میگزین کے اردو حصے کا ایڈیٹر۔

پہلی بار سفیر رحمٰن نے اسے اس سے متعارف کرایا تھا۔

سفیر انگلش حصے کا ایڈیٹر تھا اور اس نے نوٹس پڑھنے کے بعد ایک آرٹیکل اور دو نظمیں سفیر کو چھپنے کے لیے دی تھیں، جنہیں سفیر نے بے حد پسند کیا تھا۔

"یہ خوش جمال ہے۔" اس روز لائبریری سے نکلتے ہوئے سفیر اسے مل گیا تھا اور اس نے اپنے ساتھ موجود راغب سے اس کا تعارف کروایا تھا۔

"آپ واقعی خوش جمال ہیں۔" راغب نے زیرِ لب کہا تھا لیکن اس نے سن لیا اور آہستگی سے تھینک یو کہا۔

"یہ اردو حصے کے انچارج ہیں۔" سفیر نے گویا پورا تعارف کرایا۔

"میں نے آپ کی نظمیں پڑھی ہیں، بہت خوبصورت ہیں، آپ اردو میں کیوں نہیں لکھتی؟"

"کیا؟" اس نے پوچھا۔

"کوئی غزل، کوئی نظم، کوئی کہانی یا مضمون۔"

"کوشش کروں گی۔" اس نے آہستگی سے کہا تھا اور باہر چلی آئی تھی۔

اور پھر کئی دن گزر گئے۔ ایک روز سفیر نے اسے اس کا وعدہ یاد دلایا تو اس نے ایک نظم اور غزل لکھ کر سفیر کو دے دی تو دوسرے دن راغب اس کے پاس چلا آیا۔

"یقین نہیں آتا کہ یہ آپ کی پہلی کاوش ہے۔ اتنی پختگی اگر آپ لکھتی رہیں تو مجھے یقین ہے، بہت جلد صف اول کے شعراء میں آپ کا نام بھی ہوگا۔"

"اچھا......!" اسے حیرت ہوئی۔

"غزل میں ایک دو شعر وزن سے گرے ہوئے ہیں لیکن معمولی سے رد و بدل کے بعد خوبصورت غزل ہے۔"

"دراصل۔" وہ شرمندہ ہوگئی۔ "مجھے کچھ زیادہ معلومات نہیں ہیں۔ میں نے تو بس یونہی اپنے وجدان کے سہارے لکھ دی ہے اور سچ تو یہ ہے کہ مجھے قافیہ ردیف کا بھی کوئی صحیح پتا نہیں۔"

"آپ اچھے ادب کا مطالعہ کریں۔" اس نے مشورہ دیا۔ "اور اگر کچھ اور بھی لکھا ہو تو مجھے دیں، میں دیکھ لوں گا۔"

"جی بہتر۔"

اور اس کے بعد پھر طویل عرصے تک اس کی راغب سے ملاقات نہ ہوئی اور نہ ہی اس نے کچھ لکھا۔

اور ایک سال یونہی گزر گیا۔ اگلے سال جب میگزین ترتیب دیا جا رہا تھا تو راغب ایک بار پھر اس کے پاس آیا۔

"آپ میگزین کے لیے کچھ دیں گی نا؟"

"جی کوشش کروں گی۔"

"آپ نے کچھ لکھا؟"

"نہیں۔ دراصل میں زیادہ وقت پڑھائی کو دیتی ہوں۔"

اور یوں ان دو سالوں میں چھ سات دفعہ سے زیادہ اس کی راغب سے ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ پھر بھی کل...... ہاں کل ہی تو جب وہ سب کلاس فیلوز کو خدا حافظ کہہ کر ہوسٹل آ رہی تھی کہ وہ بالکل اچانک نظر آ گیا۔

"خدا حافظ!" اخلاقاً اس نے اسے بھی خدا حافظ کہا تھا۔

"میں اس وقت خدا سے دعا مانگ رہا تھا کہ کاش، جانے سے پہلے آپ سے ملاقات ہو جائے۔"



"جی۔" اس نے پلکیں اٹھائیں۔

"میں آپ سے ایک بات کہنا چاہ رہا تھا۔ دو سال پہلے آپ کو دیکھ کر میرے دل میں ایک خواہش پیدا ہوئی تھی۔ لیکن......" وہ کہتے کہتے رک گیا۔ ایک نظر اس کی طرف دیکھا اور پھر گویا ہوا۔ "میرا تعلق ایک غریب گھرانے سے ہے...... ہمارے ہاں غربت اور جہالت دونوں کی فراوانی ہے۔ میں اپنے خاندان کا واحد اور پہلا فرد ہوں جو یہاں تک پہنچا ہوں۔ مجھے اس غربت اور جہالت کے خلاف جنگ کرنا ہے اور اپنے خاندان کو اس چنگل سے نکالنا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ میں ابھی ایسی خواہشوں کو افورڈ نہیں کر سکتا۔ پھر بھی آپ کو دیکھ کر میرے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی تھی کہ کاش، زندگی کا سفر آپ کی ہمراہی میں کٹ سکتا۔ آج جب آپ جا رہی ہیں تو میرا دل چاہا کہ میں اپنی خواہش آپ تک منتقل کر دوں۔ پلیز، آپ مائنڈ نہ کیجئے گا۔ کاش، میں اس پوزیشن میں ہوتا کہ آپ کو پروپوز کر سکتا۔"

اور اپنی بات مکمل کر کے وہ بڑی تیزی سے پلٹ گیا تھا۔ اور وہ حیران سی کھڑی سوچتی رہ گئی تھی کہ یہ راغب ارمان...... یہ دلکش آنکھوں والا رومانی شاعر، ابھی ابھی کیا کیا کہہ گیا ہے۔

"کیا میں بھی کسی کو اٹریکٹ کر سکتی ہوں؟"

اس نے اپنے سادہ سے سوتی لباس اور پینتیس روپے والے جوتوں پر نظر ڈالی۔

"شاید......" اس کے اندر ایک خوشی، ایک تفخر کا سا احساس لمحہ بھر کو جاگا۔ اور پھر اس نے ہولے سے اپنے کندھوں کو جھٹکا۔

اور میں بھی...... میں بھی راغب ارمان، فی الحال اسے افورڈ نہیں کر سکتی ایسے کسی بھی پروپوزل کو سو......

"اور وہ واپس ہوسٹل چلی آئی جہاں سومیہ اپنا سامان باندھ رہی تھی۔

"کیا سوچ رہی ہو؟" سومیہ نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ "اپنا سامان تو باندھ لو ابا آنے ہی والے ہوں گے۔"

راولپنڈی تک وہ اور سومیہ اکٹھے ہی آتے تھے اور پھر راولپنڈی سے اس کے گھر تک ڈیڑھ گھنٹے کا راستہ تھا۔ سومیہ کے والد اسے ویگن پر بٹھا دیا کرتے تھے۔

"ہاں۔" وہ چونک کر اٹھی اور اپنا سامان سمیٹنے لگی۔

ان دو سالوں میں حویلی میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی تھی۔ وہی سلمیٰ آپا اور صالحہ آپا دوپہر میں بیٹھ کر کڑھائی کرتیں اور محلے کی لڑکیاں ان کے پاس اکٹھی ہوتیں اور ان لڑکیوں کے بارے میں جو موجود نہ ہوتیں، باتیں کرتیں۔ اور صالحہ آپا اور سلمیٰ آپا چمکتی آنکھوں کے ساتھ ان کی باتیں

سنتیں۔

''ہائے...... سچ،'' سلمیٰ آپا کی سرگوشیاں وقفے وقفے سے سنائی دیتیں۔

''تو پھر وہ خط لکھتا ہے رانی کو۔ اور یہ خط لاتا کون ہے۔''

''اچھا کھڑکی میں سے دونوں دیکھتے ہیں اللہ۔''

صالحہ متجسس ہو جاتی۔

یہ اور ایسی ہی باتیں۔

وہی محلے کی عورتوں کا جمگھٹ بی بی جی کے پاس لگا رہتا۔

وہی ساس نندوں کی شکایات۔

اتنا عرصہ گزرنے کے بعد بھی ان خواتین کی شکایات ختم نہیں ہوئی تھیں۔

وہ سوچتی۔ پتا نہیں بہوؤں کو اتنے گلے شکوے کیوں ہوتے ہیں۔

وہی چچی جی کے طنز تھے۔

اور وہی عبدالعلی کی تمسخر اڑاتی نظریں تھیں۔

اور شاہ جی کا جلالی غصہ۔

اور یہاں اس ماحول میں زندگی بسر کرنا بہت مشکل تھا۔ اور بی جان چاہتی تھیں کہ وہ یہیں رہے۔ شاہ جی کے زیر سایہ۔

''نہیں بی جان، نوکری ملتے ہی میں یہاں سے چلی جاؤں گی اور آپ میرے ساتھ چلیں گی۔ بہت دکھ سہہ لیے آپ نے۔''

''نہ، نہ خوش جمال، ایسا نہ سوچ۔ تجھے پڑھنے کی چاہ تھی، تو نے پڑھ لیا۔ اب یہیں رہ، شاہ جی کے زیر سایہ۔ یہاں جو تحفظ ہے، وہ کہیں اور نہیں۔''

'خاک تحفظ ہے' وہ سوچتی۔ 'صبح سے شام تک عبدالقدوس' عبدالعلی، اور عبدالوحید کی میلی نظریں، جب سے وہ یونیورسٹی سے آئی تھی اس نے محسوس کیا تھا کہ عبدالعلی اور عبدالوحید کی نظریں بدل گئی ہیں۔ عجیب نظروں سے وہ اسے دیکھتے ہیں۔ حتیٰ کہ وہ بے ڈول سر والا عبدالقدوس بھی بھوکی نظروں سے اسے دیکھتا۔ سلمانہ نے اسے بتایا تھا کہ ایک بار پھر گھر میں اس کی شادی کی باتیں ہو رہی ہیں۔ اور شاہ جی کا خیال ہے کہ اسے عبدالعلی کے ساتھ بیاہ دیا جائے۔

''اوہ نہیں۔''

اسے یہ بات بالکل پسند نہ تھی۔ چنانچہ وہ ہر روز اخبار میں ''ضرورت ہے'' کے کالم پڑھنے لگی۔ اور پھر ایک چھوٹے سے پرائیویٹ کالج میں لیکچرز کی خالی آسامی کے لیے اس نے



اپلائی کر دیا۔

اور جب اس کی انٹرویو کال آئی تو وہ بی جان کو بتا کر سومیہ کے پاس چلی گئی۔ اور وہاں سے سومیہ کو ساتھ لے کر انٹرویو دے آئی۔ پرنسپل اچھی خاتون تھیں۔ خوش اخلاق اور ہنس مکھ۔ رہائش کا بھی کوئی پرابلم نہ تھا۔ تنخواہ بھی مناسب تھی۔ کالج سے ملحق لیکچرر کے لیے دو کمروں کے کوارٹرز تھے۔

''دراصل ہمارے چھوٹے سے شہر میں لڑکیوں کے لیے تعلیم کا بڑا مسئلہ تھا۔ بہت سے والدین اپنی لڑکیوں کو میٹرک کے بعد گھر بٹھا لیتے تھے۔ دوسرے شہروں میں ہوسٹل میں بھیجنا انہیں پسند نہ ہوتا تھا۔ سو میں نے یہ کالج بنایا ہے۔'' پرنسپل نے اسے بتایا تھا۔

خوش جمال کو کالج پسند آیا تھا اور پرنسپل بھی اچھی لگی تھیں، پھر سومیہ کے شہر سے صرف پچیس منٹ کا راستہ تھا۔ اس نے اس کالج میں جاب کرنے کا ارادہ کر لیا۔ اور پرنسپل سے چند روز بعد آنے کا وعدہ کر کے چلی آئی۔

یہاں بہت سی خبریں اس کی منتظر تھیں۔ سلمانہ نے اسے بتایا، سلمیٰ آپا اور صالحہ کا خیال ہے کہ وہ کسی بوائے فرینڈ سے ملنے گئی ہے۔ اور بی جی اور چچی جان بھی ان کی ہم خیال ہیں۔

'اوہو! یہ سلمیٰ آپا اور صالحہ آپا کے ذہن کتنے زرخیز ہیں' اس نے دکھ سے سوچا۔ ''منٹوں میں کہانیاں تخلیق کر لیتی ہیں۔'

اس کا دل چاہا، وہ پورے خلوص سے انہیں مشورہ دے کہ وہ کہانیاں لکھنا شروع کر دیں۔ مفت میں کہانی نگار بن جائیں گی۔ اسے یاد تھا کہ ایک بار انہوں نے سامنے والی ننھی کے بارے میں کیسی زبردست کہانی تخلیق کی تھی۔ وہ بے چاری سلائی سینٹر میں سلائی سیکھنے جاتی تھی اور چونکہ اس کا سینٹر دور تھا۔ اس لیے وہ صبح سویرے گھر سے نکل جاتی تھی مگر سلمیٰ آپا نے ہاجرہ سے کہا۔

''دراصل یہ سویرے گھر سے اس لیے نکلتی ہے کہ اسے ایک لڑکے سے ملنا ہوتا ہے۔''

''تمہیں کیا پتا؟'' ہاجرہ نے پوچھا۔

''میں نے خود دیکھا، نکڑ پر ایک لڑکا اس کا انتظار کر رہا ہوتا ہے۔''

اور ہاجرہ تو تھی ہی چلتا پھرتا ریڈیو اس نے پورے محلے میں نشر کر دیا کہ ننھی صبح صبح ایک لڑکے کے اسکوٹر پر بیٹھ کر سلائی سینٹر جاتی ہے اور واپس بھی اسی کے ساتھ آتی ہے۔ سلائی سینٹر جانے کا تو بہانہ ہے دراصل وہ......''

شام کو عبدالعلی آیا تو سیدھا ان کے کمرے میں چلا آیا۔

''کس سے مل کر آ رہی ہو؟''

"تم کون ہوتے ہو پوچھنے والے؟" اسے غصہ آ گیا۔ جب سے آئی تھی، سب کی اوٹ پٹانگ باتیں سن سن کر تھک گئی تھی۔

"میں اس گھر کا مالک ہوں جس میں تم رہتی ہو اور میری غیرت یہ گوارا نہیں کرتی کہ تم......"

"تمہاری غیرت۔" خوش جمال نے اس کی بات کاٹ دی۔ "یہ گوارا کرتی ہے کہ تم چھت پر کبوتروں کے بہانے چڑھ کر محلے کی لڑکیوں کو دیکھو۔"

"بی جان، دیکھیں یہ خوش جمال حد سے بڑھ رہی ہے۔"

بی جان جو نم آنکھوں سے اسے دیکھ رہی تھیں، انہوں نے خوش جمال کو ڈانٹا۔

"مت بولا کرو، مت بولا کرو، خوش جمال!"

"کیا اسے خود پر غلط الزام لگانے دوں؟" اس نے بے بسی سے بی جان کی طرف دیکھا۔

"یہ الزام ہے یا حقیقتیں یہ تو رات کو شاہ جی تم سے پوچھیں گے۔"

"ٹھیک ہے تو میں شاہ جی کو جواب دے لوں گی۔"

اور عبدالعلی پاؤں پٹختا ہوا باہر نکل گیا۔

حسب توقع شاہ جی نے گھر آتے ہی اسے بلایا۔

"کہاں گئی تھیں تم خوش جمال؟" وہ نگاہیں جھکائے تسبیح کے دانے گرا رہے تھے۔ اور یہ ان کی ہمیشہ سے عادت تھی، وہ مخاطب سے نگاہیں ملا کر بات نہیں کرتے تھے۔

"میں انٹرویو دینے گئی تھی۔"

"کیا ہم اس گھر کے بڑے نہیں ہیں۔ کیا تمہارا فرض نہیں تھا کہ ہم سے اجازت لے کر جاتیں؟"

"جی مگر میں نے بی جان کو بتا دیا تھا۔"

"یہ انٹرویو کس سلسلے میں تھا؟"

"میں نوکری کرنا چاہتی ہوں اور مجھے کالج میں لیکچرر شپ مل گئی ہے۔ رہائش کا بندوبست بھی ہے۔ میں بی جان کو لے کر ایک دو روز میں چلی جاؤں گی۔"

"کیا؟" شاہ جی کے تسبیح پر چلتے ہاتھ رک گئے...... "تم اب نوکری کرو گی۔ کیا تمہیں روٹی کپڑا نہیں ملتا؟"

"روٹی کپڑے کے علاوہ بھی زندگی کی کچھ ضروریات ہوتی ہیں۔"



"کیا...... کیا چاہیے تمہیں؟"

"میں سر اٹھا کر اعتماد کے ساتھ جینا چاہتی ہوں شاہ جی۔ اور میں اپنی ماں کو اس غلامی سے نجات دلانا چاہتی ہوں۔ جو میرے باپ کے مرنے کے بعد اس کے نصیب میں لکھ دی گئی تھی۔"

"لڑکی!" شاہ جی کی آواز کانپنے لگی۔ "تم حد سے بڑھ رہی ہو۔ تمہارے باپ کے مرنے کے بعد ہم نے تمہیں اور تمہاری ماں کو چھت دی۔ تحفظ دیا۔ سائبان مہیا کیا اور تم......"

"سوری شاہ جی، شاید میں نے کچھ غلط کہا ہے۔ لیکن میں اب اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا چاہتی ہوں۔ آپ کا بہت شکریہ، آپ نے اتنا عرصہ ہمارا خیال رکھا۔"

"تم حد سے زیادہ خود سر ہو چکی ہو۔ اور یہ سارا قصور ہمارا ہے کہ ہم نے تمہیں کالج اور یونیورسٹی میں پڑھنے کی اجازت دے دی تھی۔ لیکن اب...... اب یہ ناممکن ہے...... ہم تمہیں اس کی اجازت نہیں دیں گے۔"

"آپ مجھے روک بھی نہیں سکتے شاہ جی۔"

وہ تیزی سے مڑی اور باہر نکل گئی۔

شاہ جی غصے سے تھر تھر کانپتے بی جان کو آوازیں دے رہے تھے۔

اور اس چھوٹے سے صاف ستھرے گھر میں زندگی کتنی سہل ہو گئی تھی۔ سفید دوپٹہ اوڑھے قرآن شریف کی تلاوت کرتی بی جان کو دیکھ کر خوش جمال نے بڑی طمانیت محسوس کی۔ ایسا ہی تو سوچا تھا اس نے کہ ایک چھوٹا سا گھر ہو، جہاں صالحہ آپا اور سلمیٰ آپا کی تنقیدی نظریں نہ ہوں۔ عبدالقدوس اور عبدالعلی کی میلی نظریں نہ ہوں۔ جہاں بی جان کو صبح سے لے کر رات تک کچن میں کام نہ کرنا پڑے۔ جہاں وہ اپنی مرضی سے ہنس سکے۔ اور اپنی مرضی سے رو سکے۔ بلاشبہ زندگی کی بہت سی سہولتیں ابھی وہ حاصل نہیں کر سکی تھی لیکن پھر بھی وہ یہاں اس چھوٹے سے شہر کے چھوٹے سے کالج میں بہت خوش اور بہت مطمئن تھی۔ اگرچہ رزلٹ آنے کے بعد وہ گورنمنٹ سروس کے لیے اپلائی کر سکتی تھی لیکن اسے یہ جگہ پرنسپل اور ماحول پسند آ گیا تھا، پھر تنخواہ بھی پرکشش تھی، سو وہ تین سال سے اسی کالج میں تھی۔ ان تین سالوں میں شاہ جی کے گھر سے کوئی بھی ادھر نہیں آیا تھا۔ نہ ہی وہ واپس گئی تھیں کیونکہ شاہ جی نے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ اس گھر کے دروازے اب ان پر ہمیشہ کے لیے بند ہو گئے ہیں۔ بی جان شروع شروع میں تو بہت پریشان رہی تھیں۔ لیکن اب مطمئن تھیں، البتہ آج کل انہیں اس کی شادی کی فکر ہو رہی تھی۔

بی جان نے قرآن شریف کو چومتے ہوئے جز دان میں لپیٹا اور مڑ کر اس کی طرف

دیکھا۔

’’آج کالج نہیں جانا کیا؟‘‘

’’نہیں بی جان فنکشن کی وجہ سے آج چھٹی ہے۔‘‘

’’تو پھر ناشتا بھی دیر سے کرو گی؟‘‘

’’جی، بی جان۔‘‘

اس نے آنکھیں موند لیں۔ کل کے فنکشن نے بہت تھکا دیا تھا۔ کئی دنوں سے کالج میں فنکشن ہو رہے تھے۔ اردو مباحثہ، انگلش مباحثہ، پنجابی مباحثہ، وہ بہت مصروف رہی تھی۔ باہر سے آنے والی طالبات کے کھانے اور رہائش کا خیال رکھنا۔ ڈسپلن کا خیال کرنا اس پر بہت سی ذمے داریاں تھیں۔

کل رات مشاعرہ تھا۔ مسز پراچہ اس کی انچارج تھیں۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ مہمان خصوصی کون ہے اور ججز کون لوگ ہیں۔ پرنسپل نے اس کے ذمے ڈنر کا انتظام رکھا تھا۔ جب وہ ٹیبل وغیرہ لگوا کر اور اپنا کام مکمل کر کے ہال میں آئی تو مشاعرہ شروع ہو چکا تھا اور ججز اپنی سیٹ پر بیٹھ چکے تھے۔ اسے بالکل علم نہیں تھا کہ ججز میں راغب ارمان بھی ہے۔ وہ تو مشاعرہ ختم ہونے سے پہلے ہی ڈائننگ ہال میں چلی گئی تھی...... اور ڈائننگ ہال میں ہی اس نے راغب کو دیکھا تھا۔

’’خوش جمال!‘‘ وہ اپنی پلیٹ اٹھائے اس کے قریب چلا آیا تھا۔ ’’اتنے سالوں بعد تمہیں یہاں دیکھ کر بہت خوشی ہو رہی ہے۔‘‘

اور وہ بھی اچانک اسے دیکھ کر خوش ہو گئی تھی۔

’’آپ یہاں کیسے؟‘‘

’’شاید تمہاری خوشبو یہاں لے آئی ہے۔‘‘

اس کے رخسار تپ اٹھے۔ اور نگاہیں جھک گئیں۔

’’چند ماہ ہوئے۔‘‘ راغب نے گہری نظروں سے اسے دیکھا۔ ’’یہاں انٹر کالج فار بوائز میں میرا ٹرانسفر ہوا ہے۔‘‘

’’تو آپ ٹیچنگ کر رہے ہیں۔ لیکن آپ کا مقصد تو کچھ اور تھا۔‘‘

’’ہاں لیکن جب ضرورتیں سامنے ہاتھ پھیلائے کھڑی ہوں تو پھر مقصد، خواہشیں سب پس منظر میں رہ جاتے ہیں۔ اور جو دسترس میں ہو آدمی اسی پر قناعت کر لیتا ہے۔ میں نے شاید تمہیں بتایا تو تھا کہ میرے اوپر بہت ذمے داریاں ہیں۔ بہت بڑا کنبہ ہے میرا اور مجھے انہیں غربت اور جہالت کے اندھیرے سے نکالنا ہے۔ سو جب مطلب کی جاب نہیں ملی تو یہی کر لی اور



آپ......؟‘‘

’’میں...... میں بھی یہیں جاب کرتی ہوں۔‘‘ خوش جمال نے بتایا۔

تب ہی مسز پراچہ ان کے پاس چلی آئیں۔

’’مس شاہ! میں آپ کو تلاش کر رہی تھی۔‘‘

’’دراصل یہ راغب صاحب اچانک نظر آ گئے۔ یونیورسٹی میں ہم اکٹھے تھے۔‘‘ خوش جمال نے بات بنائی۔

’’اچھا۔‘‘ مسز پراچہ نے ایک نظر اسے دیکھا اور بولیں۔ ’’آپ کی شاعری خوبصورت ہے، خالص رومانی شاعری۔ اور سچ تو یہ ہے کہ اختر شیرانی کے بعد ایسی رومانی شاعری کی جھلک آپ کے ہاں ہی ہے۔‘‘

’’اس کا مطلب ہے کہ آپ میری شاعری پڑھتی ہیں۔‘‘

’’دراصل میرے میاں بہت مداح ہیں آپ کے۔ آپ کی کوئی کتاب اب تک منظر عام پر نہیں آئی؟‘‘

’’دراصل کچھ رکاوٹیں ہیں۔ انشاء اللہ جلد ہی میرا پہلا مجموعۂ کلام آپ کے ہاتھوں میں ہو گا۔

’’آپ اپنی بیگم کو نہیں لائے؟‘‘

راغب نے کن انکھیوں سے خوش جمال کی طرف دیکھا۔ مسکراتے ہوئے بولا۔ ’’میں نے ابھی شادی نہیں کی۔‘‘

’’کیوں بھئی کوئی پرانی محبت......‘‘

مسز پراچہ نے ابھی بات مکمل نہیں کی تھی کہ پرنسپل نے خوش جمال کو بلا لیا۔ اور وہ اس سے معذرت کرتی ہوئی پرنسپل کی طرف چلی گئی۔ اور پھر وہ بہت مصروف ہو گئی۔ راغب کب گیا، اسے پتا نہیں چلا۔

کیا ہی اچھا ہوتا جو وہ جاتے سمے۔ راغب کو خدا حافظ کہہ دیتی۔

یوں ہی آنکھیں موندے موندے اس نے سوچا۔ اتنے سالوں بعد یونیورسٹی کے ایک پرانے ساتھی کو دیکھ کر اسے خوشی ہوئی تھی۔ اور وہ بالکل ویسا ہی تھا۔ ذرا بھی نہیں بدلا تھا۔ اس کی دلکش آنکھوں میں اب بھی اسے ایک لپک سی محسوس ہوئی تھی۔

اور یونہی سوچتے سوچتے اسے خیال آیا کہ یونیورسٹی میں آخری روز اس نے کہا تھا کہ:

’’وہ اگر اس پوزیشن میں ہوتا تو اسے پروپوز کرتا۔‘‘

”کیا اب بھی...... اب بھی وہ ایسا سوچتا ہوگا۔“ اس نے اپنے آپ سے پوچھا۔
اور پھر سر جھٹک کر اٹھ بیٹھی۔

”میں بھی بس یونہی اوٹ پٹانگ باتیں سوچتی رہتی ہوں۔ بھلا ان بیتے سالوں میں اسے کوئی اور نہیں ملا ہوگا کیا۔ یوں بھی وہ شاعر آدمی ہے۔ نوجوان لڑکیاں اس کی شاعری کو پسند کرتی ہیں اور کیا خبر...... کیا خبر...... وہ مسز پراچہ بھی تو کہہ رہی تھیں کہ وہ خالص رومانی شاعر ہے۔ اور شاعری میں یہ رومانس......

منہ ہاتھ دھو کر وہ کچن میں چلی آئی۔

”ارے تم اٹھ گئیں۔ میرا تو خیال تھا کہ تم دیر تک سوؤ گی۔“ بی جان نے سنک میں چائے کی خالی پیالی رکھتے ہوئے مڑ کر اسے دیکھا۔

”بس نیند نہیں آ رہی تھی۔ چائے ہے؟“

”ہاں قہوہ بنا رکھا ہے، میں بنا دیتی ہوں۔“

چائے پی کر وہ صحن میں آ گئی اور ایک کتاب لے کر بیٹھ گئی۔ ابھی اس نے چند ورق ہی پلٹے تھے کہ دروازے پر دستک ہوئی۔

”شاید کام والی مائی ہوگی۔“ اس نے سوچا اور پھر سے نگاہیں کتاب پر جما دیں۔ کیونکہ بی جان دروازہ کھولنے جا رہی تھیں۔

”خوش جمال، تم سے کوئی ملنے آیا ہے۔“

”مجھ سے!“ اس نے حیرت سے بی جان کی طرف دیکھا۔

”ہاں، میں نے ڈرائنگ روم میں بٹھایا ہے...... کوئی راغب ارمان ہے۔“

”نہیں۔“ بے یقینی کے عالم میں چلتی ہوئی وہ ڈرائنگ روم میں آئی۔

”آپ!“

”سوری۔ آپ کو ڈسٹرب کیا۔“ راغب نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا ”لیکن کل آپ سے تفصیلی ملاقات نہ ہو سکی تھی، آپ سے ملنے کو دل چاہا تو بے اختیار چلا آیا۔ آپ نے برا تو نہیں مانا؟“

”نہیں۔ آپ بیٹھیے۔“ وہ مسکرائی۔

کل وہ کس قدر بے تکلفی سے بات کر رہا تھا اور آج...... اس کے اتنے تکلف سے بات کرنے پر اسے ہنسی آ گئی۔

”تم...... سوری۔ آپ یہاں اپنی والدہ کے ساتھ رہتی ہیں۔“



”جی اور آپ مجھے تم کہہ کر بلا سکتے ہیں۔“

”اوہ، تھینک یو۔“ وہ کھل اٹھا۔ ”مجھے واقعی مشکل پیش آ رہی تھی۔ دراصل خوش جمال، تصور میں تم میرے اتنے قریب رہی ہو کہ کل جب اچانک تمہیں دیکھا تو مجھے ذرا بھی احساس نہیں ہوا کہ میں تمہیں اتنے سالوں بعد دیکھ رہا ہوں یا یہ کہ میں تم سے کبھی اتنا بے تکلف نہیں رہا بلکہ مجھے یوں ہی لگا جیسے......“

”پلیز......“ خوش جمال کا چہرہ تپ اٹھا۔

”یقین کرو خوش جمال، میں نے ان بیتے سالوں میں تمہیں بہت سوچا اور بار بار یہ سوچ کر پچھتایا کہ میں نے تم سے تمہارا ایڈریس کیوں نہ لے لیا۔ تمہیں اپنی بے تابیوں اور محبتوں کی داستان سنا کیوں نہ دی۔ تم سے انتظار کرنے کو کیوں نہ کہا۔ تمہیں خوبصورت وعدوں کی زنجیروں میں جکڑ کیوں نہ لیا۔ کل جب تمہیں دیکھا تو صبر نہ ہو سکا۔ اور صبح ہوتے ہی بے اختیار چلا آیا۔“

خوش جمال سر جھکائے حیرت سے اس کی باتیں سن رہی تھی اور اس کے رخسار گل رنگ ہو رہے تھے۔ یہ کتنی خوشی کی بات تھی کہ کوئی اسے سوچتا رہا، چاہتا رہا اور...... اور اگر صالحہ آپا یا سلمیٰ آپا کو پتا چلے کہ اس طرح کوئی یونیورسٹی فیلو تو وہ کتنی خوش ہوں، اپنی کہانیوں کے سچ ہونے پر۔

”خوش جمال! کیا سوچنے لگی ہو تم۔ میری باتیں بری تو نہیں لگیں؟“ اسے خاموش دیکھ کر راغب نے پوچھا۔

”نہیں۔“ اس نے آہستگی سے کہا۔

”اور شاید یہ محبت کا اثر ہے جو میرے دل میں تمہارے لیے تھی کہ تم...... تمہاری ابھی تک شادی نہیں ہوئی۔ میری طلب شاید سچی تھی خوش جمال!
میری پکار میں اثر تھا۔
کہ میں تم تک پہنچ گیا۔“

وہ حیران حیران سی اس کی باتیں سنتی رہی۔ اس روز وہ بہت دیر تک بیٹھا۔ بی جان سے بھی ملا۔ ان سے بھی دیر تک باتیں کیں۔ بی جان کو وہ اچھا لگا۔

”کسی اچھے خاندان کا لگتا ہے۔“ اس کے جانے کے بعد انہوں نے تبصرہ کیا۔

وہ کون تھا۔ کس خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ یہ سب کچھ تو وہ نہیں جانتی تھی لیکن اسے اتنا پتا تھا کہ اس شخص نے اسے سوچا ہے۔ اسے چاہا ہے۔ اس سے محبت کی ہے۔

سو جب کچھ عرصے بعد اس نے بی جان سے اسے مانگا، اس کا ساتھ چاہا تو وہ انکار نہ کر سکی۔

''ٹھیک ہے بی جان!'' اس نے گویا اقرار کرلیا۔

وہ عبدالقدوس اور عبدالعلی سے بہرحال بہتر تھا۔

لیکن بی جان متردد سی تھیں۔

''شاہ جی نے سنا تو وہ کیا کہیں گے؟''

''کیا کہنا ہے بی جان! ان سالوں میں انہوں نے ہماری خبر لی۔ جواب لیں گے۔''

وہ پسند تو بی جان کو بھی بہت تھا۔ سلجھا ہوا خوش شکل اور...... اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ ان کی بیٹی کو پسند کرتا تھا اور انہوں نے خوش جمال کی آنکھوں میں بھی اس کے لیے پسندیدگی کی جھلک دیکھی تھی۔

''ٹھیک ہے۔'' انہوں نے راغب سے کہا۔ ''تم اپنے والدین کو لاؤ۔ ماں باپ کی مرضی کے بغیر جو شادیاں ہوتی ہیں، وہ سکھ نہیں دیتیں۔''

''میرے ماں باپ کو کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ وہ تو میری خوشیوں میں خوش ہیں۔ میں جلد ہی اپنی والدہ کو لاؤں گا۔''

اور پھر کچھ ہی دنوں بعد انتہائی سادگی کے ساتھ خوش جمال اور راغب کی شادی ہوگئی۔ بی جان کے بلانے کے باوجود شاہ جی کے گھر سے کوئی نہیں آیا۔ بی جان کو اس بات کا دکھ تھا لیکن خوش جمال کو پروا نہ تھی۔

وہ راغب کا ساتھ پا کر بہت خوش، بہت مطمئن تھی۔ چھٹیاں گزار کر راغب جو کالج کے ہوسٹل میں رہتا تھا اس کے کوارٹر میں ہی آ گیا تھا۔ گاؤں سے اس کی ایک بہن بھی ساتھ آئی تھی اور پھر چند دن رہ کر واپس چلی گئی تھی۔

گاؤں میں راغب کا گھر بہت چھوٹا سا تھا۔ چھ بہنیں، چار بھائی اور بوڑھا بیمار باپ۔ واقعی راغب سچ کہتا تھا کہ اس پر ذمے داریوں کا بہت بوجھ تھا۔ بھائی پڑھ رہے تھے۔ بہنیں گھر میں بیٹھی تھیں اور راغب کی تنخواہ بھی زیادہ نہ تھی کہ وہ ان کی تعلیم کا خرچ برداشت کرتا۔ سو صرف بھائی اسکول اور کالج جاتے تھے۔ گھر کا ماحول بھی انتہائی جاہلانہ تھا۔ دن بھر ہاتھا پائی، گالی گلوچ۔ وہ تو چند دن میں ہی گھبرا گئی تھی لیکن راغب نے اسے تسلی دی کہ کون سا اسے ہمیشہ یہاں رہنا ہے۔ اس کی ماں اور بہنوں کو فکر تھی کہ اب راغب نے شادی کرلی ہے تو کہیں ان کا خرچ بند نہ کردے لیکن اس نے انہیں تسلی دی کہ ایسا نہیں ہوگا کیونکہ خوش جمال خود جاب کرتی ہے۔ اور خوش جمال نے بھی دل ہی دل میں فیصلہ کرلیا تھا کہ وہ غربت اور جہالت کے خلاف راغب کی اس جنگ میں اس کی مدد کرے گی۔ سو اس نے جاب نہ چھوڑنے کا فیصلہ کرلیا۔ حالانکہ شادی سے پہلے وہ اکثر سوچا کرتی



تھی کہ شادی کے بعد وہ جاب نہیں کرے گی۔ اور اس کا اظہار اس نے کئی بار راغب سے بھی کیا تھا۔ اور راغب کے بھی کچھ ایسے ہی خیالات تھے کہ اگر مجبوری نہ ہو تو عورت کو گھر سے نہیں نکلنا چاہیے۔ لیکن اب اس نے خود ہی فیصلہ کرلیا تھا کہ اسے جاب کرنا ہے، سو چھٹیاں ختم ہوتے ہی وہ کالج جانے لگی تھی۔

اور وہ جو برسوں پہلے میں نے پڑھا تھا۔

کہ عورت بھی گھاس کی طرح ہوتی ہے اور گھاس جب سر اٹھانے کے قابل ہوتی ہے تو کاٹ دی جاتی ہے...... کتنا صحیح تھا

بی جان کی گود میں سر رکھتے ہوئے خوش جمال نے سوچا۔

بی جان کے بوڑھے ہاتھ ہولے ہولے اس کے سر کو سہلا رہے تھے۔ اس کا جی چاہا، وہ یونہی آنکھیں موندے بی جان کی گود میں پڑی رہے۔ بی جان کی انگلیاں اس کے بالوں میں لرزتی رہیں اور وقت یہیں کہیں تھم جائے، رک جائے۔

''تو تو خوش نہیں ہے خوش جمال؟'' بی جان نے کانپتی آواز میں پوچھا۔

''نہیں۔ خوش ہوں۔ خوش ہوں بی جان۔'' اس نے یونہی بی جان کی گود میں سر چھپائے چھپائے کہا۔

''یہ راغب آج کل بہت دیر سے آنے لگا ہے۔''

''روز تو نہیں، کبھی کبھی جب اسے کسی مشاعرے وغیرہ میں شرکت کرنی ہو تو دیر ہو جاتی ہے۔''

''اچھا۔'' بی جان نے جیسے اس کے جھوٹ پر یقین کرلیا۔ ''تو خیال رکھا کر اس کا خوش جمال۔''

''کیا میں نے اس کا خیال نہیں رکھا ہے؟'' خوش جمال نے اپنے آپ سے پوچھا۔

ان بیتے ہوئے دس سالوں میں کس کس طرح اس نے اس کا خیال نہیں رکھا تھا۔ معاشی جدوجہد میں قدم قدم اس کے ساتھ رہی تھی۔ کس طرح اپنی خواہشوں کو مار مار کر وہ پیسہ بچاتی تھی۔ اس کی بہنوں کی شادیاں، بھائیوں کی تعلیم، باپ کا علاج۔ ان ساری ذمے داریوں کو اس نے خوش اسلوبی سے نبھایا تھا۔ اپنے پھول جیسے بچوں کو اس نے کبھی کوئی قیمتی کھلونا خرید کر نہیں دیا کبھی کوئی فضول خرچی نہیں کی۔ محض اس لیے کہ وہ راغب کے مسائل کو حل کرنا چاہتی تھی۔ اس کے معاشی پرابلمز کو شیئر کرنا چاہتی تھی۔ اس نے سوچا تھا جب مسائل اور ذمے داریوں کا بوجھ اس کے کندھوں سے اتر جائے گا تو پھر وہ زندگی کو انجوائے کرے گی۔

وہ شانی مانی اور راغب سب مل کر زندگی کو بھرپور طور پر انجوائے کریں گے۔

ان بیتے ہوئے دس سالوں میں تو اسے سر اٹھانے کی بھی مہلت نہیں ملی تھی۔ ٹیوشنز، گھر کا کام اور پھر شانی مانی کی مصروفیات، ان کے چھوٹے چھوٹے کام اور رات گئے جب وہ تھک کر چور ہو کر بستر پر لیٹتی تو راغب کا کوئی محبت بھرا جملہ کوئی خوبصورت بات اس کے تھکے ہوئے نڈھال جسم میں جان ڈال دیتا، وہ ایک دم سے پھر تروتازہ ہو جاتی، اگلے دن کی مشقت کے لیے ایک خوش آئند مستقبل کا تصور۔

'جب کندھوں پر ذمے داریوں کا بوجھ نہیں ہوگا'

اسے تھکنے نہیں دیتا تھا۔

اور اب جب ذمے داریاں ختم ہوگئی تھیں، وہ تھکنے لگی تھی۔

راغب کی چار بہنوں کی شادیاں ہو چکی تھیں۔ بھائی سب کام کر رہے تھے۔ گھر میں خوش حالی ہوگئی تھی اور راغب کو اپنی مرضی کی پوسٹ مل گئی تھی اور اس کی شاعری عروج پر تھی۔

نوجوان نسل کا مقبول شاعر۔

راغب ارمان۔

یہ دس سال کتنی بے تحاشا مصروفیت میں گزر گئے تھے۔ اسے سانس لینے کی بھی مہلت نہیں ملی تھی۔

اور اب فراغت ملی تھی تو اس نے کھلی فضا میں سانس لیتے ہوئے سوچا تھا۔

'اب زندگی اپنی مرضی سے گزرے گی۔'

اس کے اندر بھی تو ایک شاعرہ چھپی ہوئی تھی۔

ٹیوشنز چھوڑیں تو فارغ بیٹھنا اسے مشکل لگنے لگا۔ اس نے قلم سنبھال لیا۔

اور چند ماہ ہی میں اس کا نام ادبی حلقوں میں پہچانا جانے لگا۔ اسے تو خود خبر نہ تھی کہ اس کے اندر اتنا ٹیلنٹ چھپا ہوا ہے۔ لوگوں کی حوصلہ افزائی نے اس کے چھپے ہوئے ٹیلنٹ کو اور ابھارا۔ مگر راغب کے تیور بدلنے لگے۔

اسے یہ سب پسند نہ تھا۔

وہ بات بے بات غصے ہونے لگا۔

"یہ سب کیا ہے بھئی۔ بچوں کو سنبھالو۔ ان کا دھیان رکھو۔ یہ کیا قلم کاغذ لے کر بیٹھ جاتی ہو۔"

اب تو بچے بڑے ہوگئے تھے۔ اب تو ان کا دھیان رکھنے کی اتنی ضرورت بھی نہ تھی۔ اور



جب انہیں سچ مچ اس کی ضرورت تھی تب...... تب تو راغب نے ایسا کبھی نہیں کہا تھا۔ بچے روتے رہتے تھے۔ بی جان انہیں بہلاتی رہتی تھیں اور وہ ٹیوشن پڑھنے کے لیے آنے والی لڑکیوں کے ساتھ سر کھپاتی رہتی تھی۔ اور جب اچھی پرکشش پے کے لالچ میں اس نے اسلام آباد میں جاب کر لی تھی تو شروع میں جب تک وہاں رہائش کا بندوبست نہ ہوا تھا، کتنی مشکل ہوئی تھی۔ اسے ہوسٹل میں رہنا پڑا تھا اور بچے بی جان کے پاس رکھے ہوئے تھے۔ وہ کیسے کیسے ہر چھٹی پر بھاگ بھاگ کر آتی تھی۔ بچوں کے لیے کیسا کیسا تڑپتی تھی۔ تب بھی راغب نے کچھ نہیں کہا تھا۔

اور اب اچانک ہی اسے بچوں کا خیال آگیا تھا۔ اب جب وہ بڑے ہوگئے تھے اور اس سے زیادہ بی جان سے مانوس تھے تو راغب کا رویہ اسے سمجھ نہیں آرہا تھا۔

خود وہ راتوں کو دیر سے آنے لگا تھا۔

گھر ہوتا تو فون آتے رہتے۔

لڑکیاں آٹوگراف بکس اٹھائے گھر تک چلی آتیں۔

کم عمر لڑکیاں

بڑی عمر کی لڑکیاں۔

خوبصورت اور شوخ و چنچل لڑکیاں۔

لیکن اس نے تو کبھی کچھ نہیں کہا تھا۔

الٹا فخر ہی محسوس کیا تھا۔

وہ اتنا بڑا شاعر تھا۔

لوگ اسے پڑھتے تھے۔ اسے چاہتے تھے۔ اور یہ لڑکیاں بھی تو اس کی شاعری سے متاثر ہو کر اس سے ملنے چلی آتی تھیں۔

مگر راغب کو اس کا لکھنا پسند نہیں آیا تھا۔ اس کی شہرت اسے اچھی نہیں لگی تھی۔

پتا نہیں کیوں، وہ چڑنے لگا تھا۔

کوئی تعریف کرتا تو اسے غصہ آتا۔

اور اس نے کیا کچھ نہیں کیا تھا اس کے لیے...... اس کی خاطر۔

اس کی تھکن بانٹتی رہی تھی۔

اس کے پاؤں میں چبھے کانٹوں کو اپنی انگلیوں سے نکالتی رہی تھی۔

اور آج جب وہ سر اٹھا کر جینا چاہتی تھی تو راغب اسے جھکانا چاہتا تھا۔

وہ اس کا اٹھا ہوا سر نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔

کل شام ہی تو اسے ٹی وی کی طرف سے مشاعرے میں شرکت کا دعوت نامہ ملا تھا۔

''کوئی ضرورت نہیں جانے کی۔''

راغب نے دعوت نامہ پھینک دیا اور رائٹنگ ٹیبل پر پڑی ہوئی اس کی تازہ غزل کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے۔

''سنو خوش جمال! مجھے یہ تمہارا لکھنا لکھانا بالکل پسند نہیں ہے۔ اور ایسی عورتیں گھر بگاڑ دیتی ہیں۔ جنہیں گھر سے باہر......!''

''پلیز راغب'' اس نے ڈبڈبائی آنکھوں سے اسے دیکھا۔ ''میں نے صرف تمہارے گھر کو ہی نہیں، تمہارے پورے خاندان کو سنوارنے کی کوشش کی ہے۔''

''فضول باتیں نہیں کرو خوش جمال! بس میں نے کہہ دیا ہے کہ مجھے تمہارا مشاعروں میں جانا قطعی پسند نہیں ہے۔''

اور یہ کیسا مخمصہ تھا۔

خود شاعر تھا۔

شاعری کو سمجھتا تھا، جانتا تھا کہ اندر سے کچھ نکلنے کو بیتاب ہو اور لفظوں کو برتنے اور پرکھنے کا سلیقہ آتا ہو تو اچھی شاعری جنم لیتی ہے۔ اور وہ اچھی شاعرہ تھی۔ لفظوں پر اس کی گرفت مضبوط تھی اور اس کے اندر خزانے پوشیدہ تھے۔

باہر نکلنے کو بے تاب اور وہ اس پر بند باندھ رہا تھا۔ کیا وہ اس سے جیلس ہو گیا تھا۔

کیا وہ نہیں چاہتا تھا کہ وہ اس کے برابر اس کے ساتھ سر اٹھا کر کھڑی ہو۔

شاید وہ اسے اپنے پاؤں تلے رکھنا چاہتا تھا۔ اس صدی کی پیداوار کے باوجود اندر سے شاید وہ وہی دقیانوسی فرد تھا۔

عورت کو پاؤں کی جوتی بنا کر رکھنے والا۔

اسے پاؤں تلے کچلنے والا۔

''تمہیں میرے ساتھ رہنا ہے تو ایک عام عورت کی طرح رہو۔ گھر کی چاردیواری کے اندر۔ جس عورت کو شہرت کی ہوا کا چسکا لگ جاتا ہے جس کی اڑان اونچی ہو جاتی ہے، وہ شوہر کی اچھی ساتھی نہیں رہتی۔ وہ اچھی ماں بھی نہیں ہوتی اور مجھے اچھی بیوی اور اچھی ماں کی ضرورت ہے۔''

وہ کب اچھی بیوی اور اچھی ماں نہیں تھی۔

اس نے اپنا جائزہ لیا۔



اپنی خامیوں کو ڈھونڈنا چاہا لیکن کہیں کوئی جھول نظر نہ آیا۔

دراصل وہ اپنے احساس کمتری کو چھپانے کے لیے یہ سب کچھ کر رہا ہے۔

''دیکھ خوش جمال!'' بی جان نے اس کی پیشانی کو چوما تو وہ چونکی۔ ''اپنا بھی خیال رکھا کر، کیسی اجڑی اجڑی لگ رہی ہے اپنی عمر سے بڑی۔''

ان دس سالوں نے تو اس کا سارا خون نچوڑ لیا تھا۔ اور اب جو اپنے اندر توانائی پیدا کرنے کے لیے گلوکوز کی بوتل اس نے لگائی تھی تو راغب نے اس کی سوئی کھینچ لی تھی۔ وہ یونہی زرد زرد سی پڑی تھی۔

''مرد بہت حسن پرست ہوتا ہے خوش جمال اور عمر کے ہر دور میں اپنی بیوی کو خوبصورت دیکھنا چاہتا ہے۔'' بی جان بھی معلوم نہیں اسے کیا سمجھانا چاہتی تھیں۔

''آپ پتا نہیں، کیا سوچ رہی ہیں بی جان۔ میں تو یونہی، یونہی ذرا تھک سی گئی تھی۔'' وہ ہولے سے ہنسی۔

''یہ تھکن اچھی تو نہیں ہے خوش جمال! چلو اٹھو منہ ہاتھ دھو کر کپڑے بدلو، کنگھی کرو۔''

''نہیں بی جان، مجھے یونہی کچھ دیر پڑا رہنے دیں، بڑا سکون مل رہا ہے۔'' اس نے آنکھیں موندے موندے کہا۔

''خوش جمال!'' بی جان نے اپنے بازو اس کے گرد لپیٹ لیے۔ ''گھر قائم رکھنے اور اسے بنانے کے لیے عورت کو اپنی انا مارنی پڑتی ہے۔ پھر تیرے تو شہزادے جیسے بیٹے ہیں...... ان کی خاطر جو وہ کہتا ہے، مان لے۔''

'ارے بی جان تو سب کچھ جانتی ہیں۔ اس نے حیرت سے سوچا۔

''اور وہ جو کچھ کہتا ہے، کیا وہ صحیح ہے۔'' اس نے اپنے آپ سے پوچھا ''کیا مجھے یہ حق نہیں ہے کہ میں سر اٹھا کر اپنی مرضی سے جی سکوں۔''

''غلط یا صحیح کی بات نہیں خوش جمال۔'' اس نے خود کو سمجھایا۔ ''بات تو یہ ہے کہ عورت کی ترقی مرد کو خائف کر دیتی ہے اور وہ بھی خائف ہو گیا ہے۔ اور عورت تو ہمیشہ سے نارسا ہے۔''

بند آنکھوں کے اندر آنسو مچل اٹھے۔

''اور مجھے بھی بہرحال گھر کو قائم رکھنا ہے۔ چاہے وہ پانی پر ہی کیوں نہ قائم ہو۔ اور نارسائی تو عورت کا نصیب ہے، اس کا مقدر ہے۔ وہ مر کر مٹ کر فنا ہو کر بھی نارسا ہی رہتی ہے۔ مرد کا ایک بول اسے آسمان سے زمین پر پٹخ دیتا ہے۔''

''تمہیں میرے ساتھ رہنا ہے تو ایک عام عورت کی طرح رہو۔'' راغب کے الفاظ اس

کے کانوں میں گونجے۔

وہ اس کے پر کاٹ دینا چاہتا ہے۔

تا کہ وہ پرواز نہ کر سکے۔

اور وہ اپنے پر کاٹ دے گی۔

اپنے گھر کو بچانے کے لیے۔

اپنے بچوں کی خاطر۔

اس نے سر اٹھا کر بی جان کی طرف دیکھا۔ ان کے بوڑھے ہاتھوں کو آنکھوں سے لگایا اور مسکرائی۔

''آپ ٹھیک کہتی ہیں بی جان۔''

اور ہولے ہولے چلتی ہوئی اپنی رائٹنگ ٹیبل کے پاس آ کر کھڑی ہوگئی۔ اور دراز میں سے اپنی فائل نکال کر لمحہ بھر اسے دیکھا، پھر کاغذوں کو پھاڑ کر پھینکنے لگی۔

MRS TANVIR @ ONEURDU.COM